حسن سیریز

قصہ اک یتیم کا
حسن گروپ کا منصوبہ

ریحان خورشید

حسن سیریز

ریحان خوُرشید

قصہ اک یتیم کا

آج کل حسن گروپ بڑا اچھا کا پھر رہا تھا۔ ہر وقت چہرے پر مسرت رہنے لگی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ دو ڈھائی ہفتوں قبل اماں جان نے اپنا بوجھ بٹانے کے لیے ایک ملازمہ رکھی تھی، بلکہ رکھی تھیں کیونکہ وہ اماں جان سے چند سال ہی چھوٹی تھیں۔ اُن کا نام بانو بیگم تھا۔ اب حسن گروپ کی مرادیں بن آئی کہ خلافِ معمول بانو بیگم کام چور ہونے کے بجائے نہایت مستعد انداز میں کام کرتی تھیں، اور ان تینوں پر تو وہ کچھ زیادہ ہی شفیق تھیں۔ حسن گروپ کی بے وقت فرمائشیں اور رنگا رنگ پکوانوں کے مطالبے بانو بیگم جھٹ پٹ پورے کر دیتی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ زبیر اکثر اوقات نہایت جذب کے عالم میں ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا: ''خدا نے تو ہمیں دوسری ماں عطاء کر دی ہے۔''

اور اماں جل کر کہتیں: ''کم بختو! پہلی ماں کیا مر کھپ گئی ہے جو دوسری لانے کا سوچ رہے ہو؟''

زبیر تو کھسک لیتا مگر اماں جان شیراز اور صہیب سے مخاطب ہو کر کہتیں: ''ہائے! یہ یتیمی بھی کیا دکھ ہے؟ باپ کا سایہ اور ماں کی ممتا چھین لیتی ہے۔ ہک ہا! کیا قصہ سناؤں اس لڑکے کا جسے اس نامراد یتیمی نے گھیرا تھا۔''

ایک ہی دن میں چوتھی بار اماں کا یہ داستانوی فقرہ سن کر صہیب سے رہا نہ گیا اور وہ بول پڑا: ''اب سنا بھی دیں اماں! آپ کا پیٹ اور ہمارا ذہن ہلکا ہو جائے گا۔''

اماں یہ جملہ سن کر اس کی جانب گھومیں، اسے خون آشام نظروں سے گھورا اور پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولیں: ''تو ادھر آؤ بچو! آج تم کو یہ قصہ بھی سنا ہی دوں۔"

زبیر جو پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، نکل آیا اور اماں کے قریب آ بیٹھا۔ شیراز اور صہیب بھی آگے کو کھسک لیے۔ اماں پر اب گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ مدھم آواز میں بولنے لگیں: ''کسی گاؤں میں ایک لڑکا "چراغ" رہتا تھا۔"

''چراغ کیوں رہتا تھا؟ موم بتی اور شمع کیوں نہیں رہتا تھا؟ ٹیوب لائٹ اور انرجی سیور میں بھی کوئی مضائقہ تو نہیں۔'' زبیر کی زبان چل پڑی تھی۔

اماں غصیلے لہجے میں بولیں: ''زبیر اب مجھے تمہاری آواز نہ آئے، سمجھے؟'' زبیر نے صہیب والی مسمسی شکل بنائی اور جوگیوں کی طرح بیٹھ گیا۔

اماں پھر سے بولنے لگیں: ''ہاں! تو اس کا نام چراغ تھا۔ وہ بہت لائق اور سمجھدار بچہ تھا۔ والدین خود تو ان پڑھ تھے مگر بچے کو پڑھانا چاہتے تھے، اس لیے جب وہ چار پانچ سال کا ہوا تو اسے پڑھنے کے لیے گاؤں کے اسکول میں بٹھا دیا۔'' اماں کے لہجے میں ماں کی مخصوص محبت چھلکنے لگی تھی: ''پہلے ہی روز سے چراغ نے اپنی لیاقت کا سکہ جما دیا، پھر یوں ہوا کہ وہ پڑھنے لگا، اور دن گزرنے لگے، وہ ہر کلاس میں پوزیشن لیتا ہوا پانچویں کلاس میں پہنچ گیا۔ جب وہ پانچویں جماعت میں پہنچا تو اس کے باپ نے دو جگہ کام شروع کر دیا۔ اضافی تنخواہ سے وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے پھل اور میوے لایا کرتا تھا۔ یوں اس نے اپنے بیٹے کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی، سب کچھ ویسا ہی تھا مگر۔۔۔۔۔۔۔'' اماں رکیں اور پاس پڑے پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا: ''مگر ایک چیز میں بڑی واضح تبدیلی آ گئی تھی۔ اور وہ چیز چراغ کے باپ کے کپڑے تھے۔ ننھا چراغ یہ بات دیکھتا تھا، غور بھی کرتا تھا مگر سمجھ نہیں پاتا تھا کہ اس کا نفیس باپ ایسے کپڑے کیوں پہنتا ہے؟

آخر ایک دن اس نے باپ سے پوچھ ہی لیا۔ باپ ہنس کر پیار سے بولا: ''بیٹا! جس دن تو پورے ضلع میں نمبر ایک پر آئے گا نا، اس دن تیرا باپ تیرے ساتھ لٹھے والے کڑک سفید کپڑے پہن کر جائے گا سند لینے۔'' یہ سن کر چراغ کا سیروں خون بڑھ گیا اور وہ پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا۔ پھر امتحان آئے۔ اس کے ماں باپ کے ہونٹ ہر وقت دعا کے لیے ہلنے لگے تھے۔

امتحان گزرے تو چند روز کے انتظار کے بعد 31 مارچ کا دن بھی آ گیا۔ مگر چراغ کا باپ۔۔۔۔ حسبِ معمول میلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ چراغ نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو وہ قہقہہ لگا کر کہنے لگا: ''تو فکر ای نہ کر! اج میں چھیمے درزی سے کپڑے اٹھاؤں گا۔ پھر انھیں پہن کر کل تیرے ساتھ چلوں گا، ابھی تو صرف نتیجہ سن آ۔'' چراغ سر ہلا کر اسکول چلا گیا۔

اسکول دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان تقریب منعقد کی گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں تقریب شروع ہو گئی اور ہیڈ ماسٹر صاحب رسمی کارروائی کے بعد رزلٹ کا اعلان کرنے لگے۔ ساری جماعتوں کا رزلٹ ہو گیا پر ابھی چراغ کی جماعت رہتی تھی، اور اسے اپنے کانوں پر۔۔۔'' اماں نے وقفہ کیا، دوسرا گھونٹ بھرا اور پھر گویا ہوئیں: ''ہوں! تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے اعلان کیا کہ چراغ نے نہ صرف اسکول میں۔۔۔۔ بلکہ پورے ضلع میں پہلا نمبر لیا ہے۔

چراغ مزید کچھ کہے سنے بغیر فوراً گھر کی جانب بھاگا، تا کہ باپ کو یہ بتا سکے کہ اس کی دعائیں رنگ لے آئی ہیں۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں باپ کو کلف والے سفید کپڑوں میں دیکھ رہا تھا۔ جونہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوا، اس نے کچھ لوگوں کو اپنے گھر کے سامنے کھڑے پایا۔'' اماں کی آواز گہری ہو رہی تھی اور تینوں بچے دم بخود بیٹھے سن رہے تھے: ''اس نے سوچا کہ یقیناً وہ اس کے رزلٹ کی مبارکباد دینے آئے ہوں گے۔ پھر وہ اس ہجوم کو چیر کر گھر میں داخل ہو گیا۔ اگلا لمحہ اسے لرزا دینے والا تھا کیونکہ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے باپ نے سفید لٹھے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، مگر۔۔۔۔۔۔۔'' اماں کی آواز بھرا گئی۔

وہ کھڑا نہیں تھا، پلنگ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ اس نے الجھ کر ماں کی جانب دیکھا۔۔۔۔'' اماں کی آنکھوں سے بھی آنسو گر رہے تھے، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی تھے کہ ''کہ وہ دنیا کی دھوپ میں ملنے والا واحد سایہ کھو چکا ہے۔ اور اگلے کتنے ہی گھنٹے اس نے بے ہوشی کے عالم میں گزار دیے۔ جب ہوش آیا تو وہ اٹھ کر باپ کی چارپائی کی جانب بھاگا، اور گرد و پیش سے بے خبر، پلنگ سے سر ٹکرانے لگا، اس کی چیخیں لوگوں کا دل چیر رہی تھیں۔

وہ کہہ رہا تھا: ''ابا! تو نے سفید کپڑے تو پہن لیے، اب سند لینے بھی آ جا۔'' ماں نے بمشکل اسے سنبھالا تھا۔ یہ ماں ہی تھی جس کے فیض سے وہ۔۔۔ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلی کلاس میں داخلہ لیا اور پڑھنے لگا۔''

اماں نے تیسرا گھونٹ لیا اور دوبارہ بولیں: ''لائق وہ شروع سے تھا، ابا کی دل کے دورے کے باعث ہونے والی موت نے اسے بڑے سے بڑے غم کا سامنا کرنا سکھا دیا تھا۔''

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایڈ فری لنکس
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

امی کی آنکھوں میں عجب سا غم تھا: ''مکان اپنا تھا، اس لیے سر چھپانے کا مسئلہ ہوا۔ مگر چند ماہ بعد جمع پونجی ختم ہونے لگی تو ماں نے ہمت کی اور کچھ سامان بیچ کر گھر میں کپڑے کی کھڈی لگوالی۔

اب وہ ہر وقت کھڈی پر کپڑا بننے میں لگی رہتی۔ اور جب جی اکتا تا تو۔۔۔۔۔۔'' اماں غمگین انداز میں مسکرائیں: ''تو وہ سلائی کڑھائی کرنے لگتی۔ خدا نے فضل کیا اور ماں یونہی پانچ سال تک کھڈی کے ریشوں سے رزق کا جال بنتی رہی۔ چراغ اب میٹرک کے امتحان دے رہا تھا۔ امتحان دے کر جونہی وہ فارغ ہوا، اس نے ماں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ کوشش کے بعد ایک معمولی سی نوکری اسے مل ہی گئی۔ اسی دوران اس کا رزلٹ بھی آگیا۔ چراغ رزلٹ سن کر بے اختیار سجدہ ریز ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر سے پورے ضلع میں ٹاپ کیا تھا۔''

اماں رکیں، ٹھنڈی سانس لی اور پھر سے گویا ہوئیں: ''وہ خوشی کے مارے گھر کی جانب بھاگ اٹھا، جونہی اس نے گھر میں قدم رکھا۔۔۔ ایک مہیب سناٹا اس کا منتظر تھا جو کسی انہونی کی خبر دیتا تھا۔ اس نے ماں کو آوازیں دیں، مگر جواب نہ ملا۔ وہ دیوانہ وار ماں کو ڈھونڈنے لگا، اور تھوڑی سی کوشش کے بعد ماں مل گئی۔

ماں۔۔ جو کھڈی سے ٹیک لگائے، نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ماں کو اپنی کامیابی کی خوشخبری سنائی، مگر اس کے جسم میں جنبش نہ ہوئی۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے ماں کے جسم کو ذرا سا ہلایا تو۔۔۔ ماں ایک طرف ڈھے گئی تھی۔ اسے پہلے :باپ کا غم اور پھر کام کی زیادتی کھا گئی تھی۔'' اماں کی آواز گلوگیر ہونے لگی۔

باپ کے مرنے کے بعد پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یتیمی کسے کہتے ہیں؟ زندگی سے اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ وہ چاروں طرف اندھیرا محسوس کرتا تھا۔ پھر اسے دفعتاً اپنے باپ کے اونچے خواب یاد آنے لگے۔ اس نے ایک شام خدا کو، جو اس کا آخری رفیق تھا کہا: ''اے اللہ! میری یتیمی کو مثبت بنا دے۔ مجھے ان مایوسیوں سے نکال دے۔'' پھر اس کی آواز قدرے دھیمی ہو کر ابھری: ''میرا نام اتنا بلند کر دے کہ میرے ماں باپ کی روحیں اسے آسانی سے دیکھ سکیں۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور خوش ہو سکیں۔'' وہ رو پڑا تھا، مگر اس کے بعد اس نے اپنے غم جھٹک دیے۔ وہ زندگی کو ایک مقصد کے لیے جینے لگا تھا، ہفتے میں دو دن وہ گاؤں کے چودھری کے پاس کام کرتا تھا۔ اتوار کو شہر میں پہلے اخبار بیچا کرتا اور پھر ایک دکان پر کام کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ پڑھائی جاری رکھے ہوئے تھا۔ ایک اتوار کو جب وہ دکان سے لوٹ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔۔۔۔ کامیابی کی چمک۔۔۔'' اماں

کی آواز جذبات سے لرز رہی تھی۔ انھوں نے چوتھا گھونٹ لیا: ''اس کے پاس اتنے پیسے ہو گئے تھے کہ وہ آگے داخلہ لے سکتا، اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا۔ ان پیسوں سے وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کی عمارت تعمیر کرنے لگا۔ اس نے صحافت میں ایم اے کیا اور ایک اخبار سے منسلک ہو گیا، دوسرے اکثر صحافیوں کے مضامین کھوکھلے اور بے مزہ ہوتے تھے۔ مگر جب اس نے ماں کے عنوان پر پہلا کالم تحریر کیا تو ہر پڑھنے والا رو پڑا تھا۔ کیونکہ ماں باپ کی جدائی نے اس کے الفاظ میں بہت درد بھر دیا تھا، اسی صلاحیت کی بدولت وہ پہلے اپنے اخبار ہی میں ترقی پاتا رہا، پھر ایک دوسرے بڑے اخبار میں لکھنے لگا۔ جب مزید کچھ اخباروں میں اس کی تحریریں چھپیں تو کتنے ہی اخبارات کے دعوت نامے اس کی راہ میں بچھ گئے تھے۔ اس کا خواب تعبیر کو پہنچا تھا۔ بے باک صحافت اور نہ بکنے والے قلم کے باعث اسے کئی انعامات اور اعزاز ملے۔ تو بچو! یہ تھا اس کی یتیمی کا قصہ۔'' اماں کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اسی وقت گلزار صاحب اندر داخل ہوئے اور بولے: ''السلام علیکم!'' اماں جواب دے کر فوراً بولیں: '''اور بچو! جانتے ہو کہ چراغ کون ہے؟''' 'کون؟'' بچوں نے نعرہ لگایا۔ اماں مسکرائیں اور گلزار صاحب کی جانب دیکھ کر بولیں: ''تمہارے دادا جان، چراغ الدین محمد،'' تینوں نے پر تعجب ''ہائیں،'' کے ساتھ گلزار صاحب کی طرف دیکھا تو ان کی آنسوؤں کی نمی لیے آواز بلند ہوئی: ''ہاں! یہ حقیقت ہے۔ میں اندر داخل ہونے سے پہلے کچھ کہانی سن چکا ہوں۔''

''بری بات ابا جان!'' زبیر نے ناراضی سے کہا: ''یوں کسی کی باتیں نہیں سنتے۔'' گلزار صاحب نے دانت پیس کر اس کی جانب دیکھا تو :وہ بھاگ گیا۔ باقی دونوں بھی چل دیے۔ گلزار صاحب کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں سے یہ شعر جھلک رہا تھا

مضطرب اے دل نہ ہو نا ذوقِ طفلی کے لیے

تو بنا ہے تلخیء اشکِ یتیمی کے لیے

☆☆☆☆☆☆☆☆

حسن گروپ کا منصوبہ

اسکول میں تفریح کا وقت تھا، اسی لیے ہر طرف بھاگتے دوڑتے بچے نظر آرہے تھے۔ حسن گروپ اسکول کے سبزہ زار میں بیٹھا لنچ کر رہا تھا۔

اگرچہ گذشتہ واقعہ کے بعد وہ خاصے شریف بن چکے تھے مگر کہتے ہیں کہ کتے کی دم کو سو برس تک نلکی میں ڈالے رکھو تب بھی وہ سیدھی نہیں

ہوتی، تو ان کا بھی یہی حال تھا۔

گھر سے تو امی جان نے لنچ باکس میں آلو کے پراٹھے رکھے تھے مگر زبیر کا کہنا تھا کہ ایسی غذائیں کولیسٹرول بڑھاتی ہیں۔ پس بریک تک ان کے لنچ باکس میں آلو پراٹھے کی جگہ ایک سینڈوچ اور اس جیسی دو تین اور چیزیں آچکی تھیں، اور رہی بات آلو کے پراٹھوں کی تو وہ ساتھ والے کلاس فیلو کے لنچ باکس میں منتقل ہو چکے تھے۔ اور وہ بے چارا بار بار لنچ باکس کو دیکھ رہا تھا کہ صبح تو امی جان نے لنچ باکس میں سینڈوچ رکھے تھے، اب یہ آلو پراٹھے کہاں سے آن ٹپکے؟ بہر حال یہ ہمارا موضوع نہیں، تو ہم واپس حسن گروپ کے پاس چلتے ہیں۔

وہاں شیراز کہہ رہا تھا: ''تمھیں احمد دین کی چاٹ اور گول گپے یاد ہیں؟''

''ہاں! وہی احمد دین نا، جس کی ریڑھی سے ایک بار شیراز نے پیسے دیے بغیر چاٹ کھائی تھی۔ اور ایک بار تو اس کا گلّہ ہی اٹھا کر بھاگ گیا تھا۔ پھر ابا جان نے اپنی چھتری سے اس کی اتنی ٹھکائی کی تھی کہ اس کی عینک کا شیشہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔'' زبیر قہقہے لگا کر بول رہا تھا، مگر جب شیراز نے اسے گھورا تو وہ فوراً سنجیدہ ہو کر بولا:

''اچھا کہو!'' شیراز نے کہا: ''اب اس کی چاٹ کھانا چاہتے ہو؟''

دونوں اچھل پڑے: "کیوں نہیں! کیا مزہ تھا اس کے ہاتھ میں!" مگر دو ہفتے ہوئے اس نے اسکول آنا چھوڑ دیا ہے، اب یہ کیسے ممکن ہو گا؟" صہیب نے سوال کیا، تو شیراز آگے جھک کر بولا: "ہاں! مگر میں نے اس کی جاسوسی کی تھی، اور اب مجھے اس کا پورا شیڈول زبانی یاد ہے۔"

"کک۔۔۔۔ کیا؟" دونوں مسرت اور جوش سے چیخے۔ "آہستہ بولو، اور میری بات سنو" شیراز نے لمبا سانس لیا اور شروع ہو گیا: "احمد دین اتوار کا دن چھوڑ کر ہر روز گلستان بازار میں پاکستان چوک پر ریڑھی لگاتا ہے۔ سوا بارہ بجے وہ العلم اسکول چلا جاتا ہے، کیونکہ وہاں کے بچوں کی چھٹی ساڑھے بارہ بجے ہی ہو جاتی ہے۔ ڈیڑھ بجے وہ۔۔۔۔"

"مگر ہماری چھٹی تو اڑھائی بجے ہو گی نا!" صہیب نے مایوسی سے کہتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ شیراز نے اسے گھور کر کہا: "پوری بات سنو، ہاں! تو ڈیڑھ بجے وہ شہر کے دوسرے کونے الفیصل کالونی کا رخ کرتا ہے۔ اتوار کو وہ شہر کے مضافات میں ریڑھی لگاتا ہے۔" شیراز کو اس کا شیڈول یوں یاد تھا جیسے کسی وزیر اعظم کے سیکرٹری کو وزیر اعظم کا شیڈول یاد ہو، بہر حال یہ شیڈول سن کر زبیر نے زبان کھولی: "تو اب ترکیب بھی تو بتاؤ نا۔۔۔" شیراز چونکا: "کیسی ترکیب؟"

"احمد دین کی ریڑھی سے چاٹ کھانے کی ترکیب۔۔۔ اور کون سی ترکیب؟" "مجھے کوئی ترکیب ورکیب نہیں آتی۔ میں تو صرف شیڈول بتا رہا تھا۔" اور زبیر اور صہیب پر تو جیسے کوہِ ہمالیہ ٹوٹ پڑا۔ انھوں نے صدمے کی حالت میں شیراز کو دیکھا، زبیر کا دل چاہا کہ وہ اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرا دے۔ مگر سامنے سے گزرتے اساتذہ کرام کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔ صہیب کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی، آخر زبیر اٹھ کھڑا ہوا اور جانے لگا، مگر جانے سے پہلے اس نے انگلی اٹھائی اور ایک ایک لفظ چبا کر کہا: "بریک کے بعد کلاس روم میں۔۔۔ ایک عدد ترکیب کے ساتھ ملنا۔۔ ورنہ۔۔۔۔" اور شیراز اس ورنہ کا مطلب جانتا تھا۔

زبیر کے کمپیوٹر جیسے دماغ میں شیراز کے بیسیوں کارنامے محفوظ تھے اور اگر ان میں سے ایک بھی کارنامہ گلزار صاحب کے آگے کھل جاتا تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر چھوڑیے اور واپس شیراز کی طرف چلیے۔ شیراز، زبیر کی بات سن کر بھنایا اور ترکیب سوچنے بیٹھ گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بریک بند ہوئی، بچے کمروں میں آنے لگے۔ زبیر اور صہیب بھی کمرے میں آکر شیراز کا انتظار کرنے لگے۔ آخر وہ آتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ دونوں کے دل دھڑکنے لگے۔ جب وہ نزدیک آگیا تو زبیر نے بے چینی سے کہا: ''کوئی تدبیر سوجھی؟'' اس نے کہا: ''ہاں! مگر مرے کیوں جاتے ہو؟ چھٹی کے بعد بتادوں گا۔'' زبیر دانت کچکچا کر رہ گیا۔
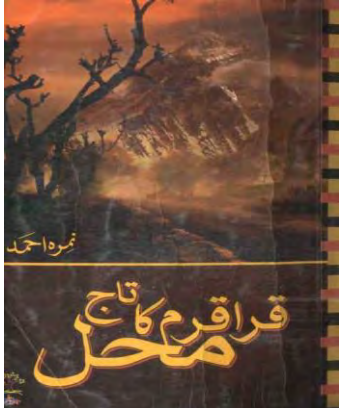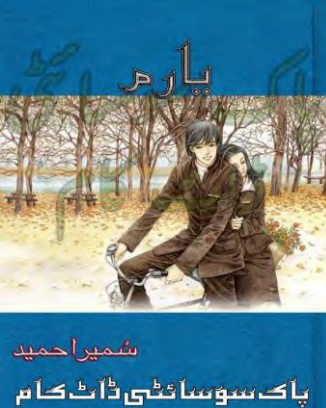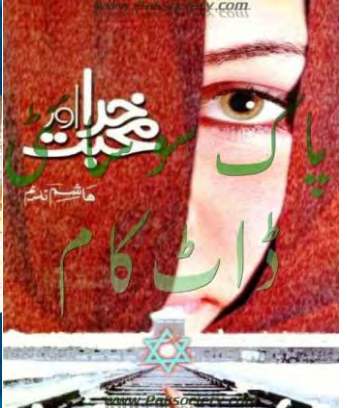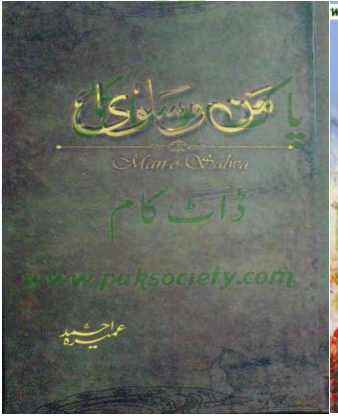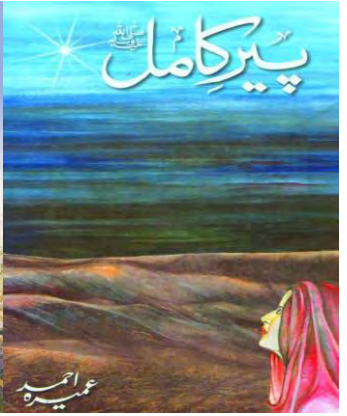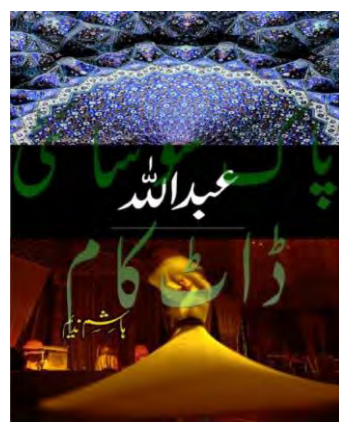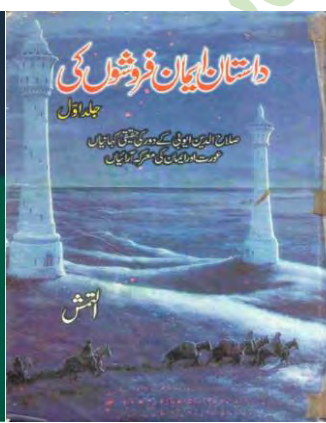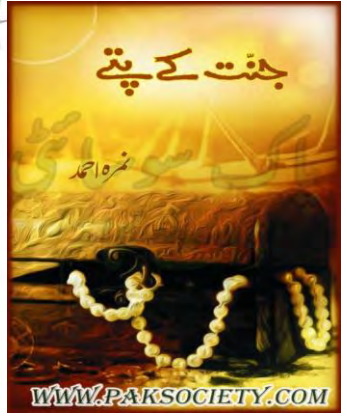
چھٹی کے فوراً بعد جب دونوں اسکول گیٹ سے نکل رہے تھے شیراز نے اپنی بات شروع کی اور بولتا چلا گیا۔ اس کا منصوبہ سن کر باقی دونوں کی آنکھیں خوف سے ابلنے لگیں۔ صہیب نے کہا: ''اس قدر۔۔ خ۔۔۔ خوفناک منصوبہ!'' ''ہاں، اس میں تو بہت خطرہ ہے۔'' زبیر نے بھی صہیب کی تائید کی۔ شیراز نے کندھے اچکائی: ''تم نے منصوبہ مانگا میں نے دے دیا۔ آگے تمہاری مرضی۔ ' 'تھوڑی دیر بعد زبیر اور صہیب کی مری مری ہاں سنائی دی اور وہ مزید تفصیلات طے کرنے لگے۔

اگلے دن جونہی بریک کی گھنٹی بجی حسن گروپ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ تینوں علیحدہ علیحدہ ہوگئے۔ یہاں ہماری کہانی بھی تین حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ تو سب سے پہلے شیراز کا حال سنیے:

شیراز ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے باہر جا پہنچا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب اندر ہیں یا نہیں۔ وہ آس پاس منڈلانے لگا۔ آخر کوئی دس منٹ بعد ایک چپڑاسی آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس پر چائے کا صرف ایک کپ رکھا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کمرے میں اکیلے ہی موجود ہیں۔ شیراز فوراً اندر جا گھسا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیکھ کر بولا: ''السلام علیکم! سر۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے باآوازِ بلند اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ شیراز کو جانتے تھے (یا لیاقت کے باعث یا شرارت کے باعث)۔ سلام کا جواب دینے کے بعد بولنا وہ شروع ہوگئے، آپ کو بتاتے چلیں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب میں تین نمایاں خصوصیات تھیں۔ پہلی کہ بہت باتونی تھے۔ دوسری کہ بہت بھولے تھے۔ اور تیسری یہ کہ بچوں کی طرح نخریلے اور غصیلے تھے۔ اسی لیے شیراز نے اپنے منصوبے میں مرکزی کردار انھی کا رکھا تھا۔ بہر حال اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی پہلی خصوصیت کا استعمال کیا اور ان کی باتیں شروع ہوگئیں یہی کہ بیٹا آپ کیسے ہیں؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ ابو کیسے ہیں؟ پانچ منٹ بعد انھیں خیال آیا تو انھوں نے پوچھا: ''یہ تو بتاؤ کہ کیسے آئے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا کام تھا؟'' شیراز نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ

تھے۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو گیارہ بج کر پینتالیس منٹ تک باتوں میں الجھائے رکھنا تھا۔ شیر از کو تو موقع مل گیا تھا۔ اس نے اپنا پتا پھینکا: ''وہ دراصل۔۔۔ سیکیورٹی انچارج صاحب۔۔۔ لائبریری کی کتابوں کی چوری کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ تو انھوں نے آپ کو اپنے آفس بلایا ہے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب کی اونچی دھاڑ نے اس بات کا ثبوت دیا کہ شیر از ان کی دوسری اور تیسری خصوصیات کامیابی سے استعمال کر چکا ہے۔ اب وہ زور زور سے چیخ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ سیکیورٹی انچارج کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ''انھیں'' اپنے آفس بلائیں۔

آخر تین چار منٹ بعد انھوں نے کہا: ''ٹھہرو! میں ابھی اس کے پاس جا کر اس کی خبر لیتا ہوں۔'' شیر از چونک اٹھا: ''نہیں، نہیں سر! اگر آپ ان کے پاس جائیں گے تو ان کا مقصد تو پورا ہو جائے گا۔ بہتر ہو گا کہ آپ ان سے فون پر بات کریں۔'' شیر از کی تجویز سن کر وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئے، اور فون کرنے لگے۔ شیر از فوراً بھاگا اور گھوم کر آفس کی پچھلی سمت میں آیا، وہاں ایک ٹیلیفون تار پڑی تھی، مگر کٹی ہوئی تھی۔ یہ زبیر کا کارنامہ تھا تاکہ عین وقت پر کسی کا فون نہ آجائے۔ شیر از نے گھڑی پر وقت دیکھا، گیارہ بج کر چوالیس منٹ ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب جو نہی فون ملانے لگے، شیر از برق رفتاری سے حرکت میں آیا اور تار کو کچھ تکنیکوں سے جوڑ دیا۔ یہ سب کر کے وہ اپس کلاس روم میں آگیا، گھڑی گیارہ بج کر پینتالیس منٹ بجا رہی تھی۔

اب صہیب کی سنیے، حسن گروپ سے جدا ہو کر وہ سیکیورٹی انچارج کے کمرے میں گیا۔ وہ سیکیورٹی کیمروں کی سکرین کے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک کیمرہ گیٹ پر بھی نصب تھا۔ صہیب نے انھیں دیکھ کر سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے خشونت سے کہا: ''کہو! کیا کام ہے؟'' صہیب نے گھڑی کی جانب دیکھا، گیارہ بج کر پینتیس منٹ تھے، اور ابھی دس منٹ انھیں باتوں میں لگائے رکھنا تھا۔ اس نے کہا: ''سر! بس یہ اسکرین دیکھنے آیا تھا'' انچارج صاحب اسے گھور کر بولے: ''اب دیکھ لی ہے تو جاؤ۔'' صہیب نے کہا: ''سر! اصل میں۔۔۔ مجھے آپ سے لائبریری کے متعلق کچھ بات کرنا تھی۔'' انچارج صاحب کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ در حقیقت چند دن پہلے انھوں نے لائبریری کی کچھ بیش قیمت کتابیں گم کر دی تھیں۔ اسکول میں اس معاملے کے متعلق نہایت سخت قانون تھا، انھیں کتابوں کی دگنی قیمت بھی دینا پڑ سکتی تھی، اسی لیے وہ ڈرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ زبیر کو

اس معاملے کا علم ہو گیا۔ بہر حال صہیب بیٹھ گیا اور کچھ لا یعنی باتیں کرنے لگا، انچارج صاحب اس کی ساری بکواس محض اس لیے برداشت کرتے رہے کیونکہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کہیں صہیب کو اس راز کا پتا تو نہیں لگ گیا۔ بالآخر گھڑی نے گیارہ بج کر چوالیس منٹ بجائے تو صہیب نے یکدم کہا: ''اوہ یاد آیا۔۔۔ مجھے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، وہ آپ سے گم شدہ کتابوں کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے مزید یہ کہ وہ بہت غصے میں تھے، اور چونکہ آپ اب تک وہاں نہیں پہنچے لہٰذا ان کا فون آنے ہی والا ہو گا۔'' صہیب کی بات مکمل ہوتے ہی وہ اچھل پڑے کیونکہ اسی وقت ان کے فون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو دوسری طرف ہیڈ ماسٹر صاحب تھے۔ انچارج صاحب جانتے تھے کہ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب شروع ہو گئے تو پھر صفائی کا موقع نہیں ملے گا، پس وہ بولے: ''سر! میں آ رہا ہوں۔'' اور فون بند کر دیا۔ فون بند کر کے وہ اٹھے اور صہیب کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔ جونہی وہ اوجھل ہوئے، صہیب فوراً اٹھا اور اسکرین کے نیچے موجود ایک بٹن دبا دیا۔ یہ بٹن دبانے سے اسکرین کا منظر منجمد ہو گیا۔ یعنی کیمرے کے سامنے کوئی نقل و حرکت ہوتی بھی سہی تو یہاں نظر نہ آتی، بلکہ منظر وہی رہتا۔ اسکرین پر کوئی ایسا اشارہ بھی نہ ابھرا جس سے پتا چلتا کہ منظر منجمد ہو چکا ہے۔ صہیب یہ کر کے کلاس روم میں جا پہنچا۔ وہاں شیراز کو دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا اور مختصر الفاظ میں اسے سارا قصہ سنا دیا، اب صرف زبیر کا انتظار تھا۔

اور اب زبیر کی کارستانی سنیے۔ اس کا کام سب سے آسان تھا، وہ آرام سے چلتا ہوا گیٹ کے پاس پہنچا، مگر ابھی گیارہ بج کر بتیس منٹ تھے، اور اسے تیرہ منٹ انتظار کرنا تھا۔ وہ سکون سے چلتا ہوا واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کے عقب میں گیا اور وہاں پڑی ٹیلیفون تار کاٹ دی۔ واپس آ کر وہ سیکیورٹی انچارج صاحب کے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے انچارج صاحب کو دفتر سے نکلتے دیکھا، ان کا چہرہ زرد تھا۔ زبیر فوراً گیٹ کی طرف بڑھا، وہاں ایک ہی چوکیدار موجود تھا۔ زبیر نے اسے دیکھ کر اپنے قدم تیز کر لیے۔ چوکیدار اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ زبیر نے اس کے پاس پہنچ کر کہا: ''انکل! سر احمد حسین (سیکیورٹی انچارج) آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہ اصل میں ان بچوں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں جنھیں آپ نے کل اسکول کے اوقات کے دوران گیٹ سے باہر جانے دیا تھا۔ انچارج صاحب بڑے غصے میں تھے۔'' چوکیدار کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے کل کچھ

رشتہ دار بچوں کو گیٹ سے باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ اس وقت انچارج صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ چوکیدار ڈرتے ہوئے بولا: ''اچھا جاتا ہوں۔'' زبیر بھی جانے لگا، مگر جانے سے پہلے اس نے کہا: ''انکل! انچارج صاحب نے کہا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اسکول راؤنڈ پر جارہے ہیں، آپ ابھی ان کے آفس میں جا کر ان کا انتظار کریں۔ ویسے بھی ادھر اسکرین لگی ہوئی ہے، گیٹ پر بھی نظر رکھ سکتے ہیں۔'' چوکیدار سر ہلا کر جانے لگا تو زبیر بھی مطمئن ہو کر کلاس روم میں آ گیا، باقی دونوں اسے دیکھ کر کِھل اٹھے، اب وہ گیٹ کی جانب بڑھے، چوکیدار غائب تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گیٹ پار کر گئے۔ باہر اسکول پارکنگ سے انھوں نے اپنی سائیکلیں نکالیں اور گلستان بازار کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہ بازار ان کے اسکول سے پانچ منٹ کے فاصلے پر واقع تھا۔ آندھی طوفان کی طرح سائیکلیں چلاتے وہ جلد ہی گلستان بازار جا پہنچے، وہاں سے انھوں نے پاکستان چوک کا رخ کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ احمد دین کی ریڑھی سے چاٹ کھا رہے تھے۔ چاٹ کھاتے ہوئے ان کے چہرے سے شرافت یوں ٹپکی پڑتی تھی کہ احمد دین بولا: ''خدا سب کو ایسی شریف اولاد عطاء کرے۔'' تینوں نے ایک لمبی آمین کی، اس بے چارے کو اس طوفانِ ''شرافت'' کا کہاں پتا تھا جو وہ پیچھے برپا کر آئے تھے۔ چاٹ کھا کر انھوں نے قیمت ادا کی اور واپسی کے لیے مڑ گئے، صہیب نے کہا: ''پیچھے کیا ہو رہا ہو گا؟'' شیراز نے لاپروائی سے کہا: ''ہونا کیا ہے؟ ہیڈ ماسٹر صاحب چند منٹ تک انچارج صاحب پر برسے ہوں گے، پھر انچارج صاحب کے اپنے ہی منہ سے ان کا راز کھل گیا ہو گا۔ ایک دفعہ اور ڈانٹ ڈپٹ ہو گی، پھر وہ اپنے آفس میں آئیں گے، تو چوکیدار ڈر کے مارے خود اپنا معاملہ کھول دے گا اور وہ اپنا غصہ اس پر اتاریں گے، اس نفسا نفسی میں ہمیں کون یاد کرے گا؟'' شیراز کے انداز پر وہ مطمئن ہو کر چل پڑے۔ اسکول پہنچے تو بارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے، بریک سوا بارہ بجے ختم ہوتی تھی۔ وہ گیٹ پر پہنچے تو چوکیدار اب تک نہیں آیا تھا۔ تینوں فاتحانہ انداز میں اندر داخل ہوئے، اسی وقت ہیڈ ماسٹر کے کمرے سے انچارج صاحب نکلتے دکھائی دیے۔ وہ اس قدر خجل تھے کہ ان پر توجہ نہ دی، یہ الگ بات ہے کہ تھوڑی دیر بعد ان کے کمرے سے آوازیں آنے لگی۔ شاید وہ اپنی بھڑاس چوکیدار پر نکال رہے تھے۔ تینوں قہقہے لگاتے ہوئے کلاس روم کی جانب چل پڑے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

حسن گروپ رات کے وقت اپنا اسکول کا کام کر رہا تھا جب ان کے والدِ گرامی گلزار صاحب اندر داخل ہوئے۔ تینوں اسلام علیکم کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ گلزار صاحب نے وعلیکم السلام کہا اور بیٹھ گئے۔

زبیر نے پوچھا: ''ابا جان! آپ اس وقت؟'' ''بھئی! میں ذرا تم سے بات کرنے آیا تھا۔'' گلزار صاحب نے اسے گھور کر کہا۔ ''کیسی بات؟؟'' تینوں نے بہ یک آواز کہا۔

''میں ذرا اس چاٹ کے متعلق پوچھنے آیا تھا جو پاکستان چوک پر بڑے مزے سے کھائی جا رہی تھی۔'' تینوں کو 440 وولٹ کا کرنٹ لگا۔ شیراز نے ہکلا کر کہا: ''کک۔۔۔ کیا مطلب ابا جان؟'' ''سیدھی طرح بتاؤ کہ اسکول ٹائمنگ میں تم وہاں کیسے پہنچے؟'' گلزار صاحب نے انھیں آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تو شیراز فوراً شروع ہو گیا۔

گلزار صاحب نے ساری داستان سننے کے بعد ایک لمبی ہوں کی اور بولے: ''میں تو سمجھتا تھا کہ تم سچ مچ تائب ہو چکے ہو مگر تم تو۔۔۔ تم نے اپنے اس منصوبے کے لیے ہیڈ ماسٹر صاحب کو استعمال کیا، انچارج صاحب کی بے عزتی کروائی اور پھر چوکیدار کو ذلت کا سامنا کرنا پڑا، حد ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ تم ہیڈ ماسٹر صاحب کے جذبات سے کھیلے، اپنے ایک استاد کا راز کھولا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک گناہ ہے،''

''مم۔۔۔ مگر ہم نے تو ان کی چوری ہی ظاہر کی ہے نا۔'' شیراز منمنایا۔

گلزار صاحب ترش لہجے میں بولے: ''تم انکوائری کمیٹی نہیں تھے، تم جج نہیں تھے، تمہیں کوئی اختیار نہیں تھا پھر۔۔ پھر تم نے کس زعم میں یہ سب کچھ کیا۔۔۔ تف ہے تم پر۔۔۔ تم نے ایک غریب آدمی کو بھی بے عزت کروایا، میں کیا کہوں؟؟'' ان کی آواز غیظ و غضب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''اب میں یہی کر سکتا ہوں کہ تمہارا منصوبہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے کھول دوں تاکہ تمہاری بھی اتنی ہی بے عزتی ہو۔ پھر شاید مجھے سکون مل جائے۔''

''نن۔۔۔۔ نہیں ابا جان!'' تینوں لرز اٹھے، اس بات کا تو تصور ہی ہولناک تھا۔ گلزار صاحب نے تینوں کو کانپتے دیکھا تو ہنسی ضبط کر کے انھیں سنجیدگی سے سمجھانے لگے۔ پانچ منٹ کے لیکچر کے بعد وہ جانے لگے تو زبیر نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا: ''ابا جان! آپ

نے ہمیں کہاں دیکھا؟'' وہ مسکرائے اور بولے: ''میاں صاحبزادے! پاکستان چوک کے نکڑ پر کس کی دکان ہے؟'' اور تینوں نے ایک طویل ''اووووووہہہ!'' کی، وہاں دراصل اباجان کے ایک پرانے دوست کا جنرل اسٹور تھا، اباجان سودا ہمیشہ وہیں سے لیتے تھے، اسی لیے زبیر اس اسٹور کو ''فیملی ڈاکٹر'' کی طرز پر ''فیملی اسٹور'' کہتا تھا۔

اباجان یقیناً اس وقت وہیں ہوں گے، زبیر چکراتے سر کے ساتھ یہ ساری باتیں سوچ رہا تھا، آخر میں جب اسے یاد آیا کہ یہ منصوبہ شیراز کا تھا تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شیراز کو اگلے دن نئی عینک لینا پڑی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

ختم شُد

آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔۔